ضلع اعظم گڑھ میں عزاداری کی روایت

ڈاکٹر علاء الدین خاں☆

ماہِ محرم ہجری سال کا پہلا مہینہ ہے۔ یہ مہینہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل بھی اہمیت رکھتا تھا اور نبی کریمؐ کے زمانۂ مبارک میں بھی اہم تھا۔ حضورؐ کے بعد اسی مہینہ میں سانحۂ کربلا پیش آیا جو تا قیامت باعث رنج و غم رہے گا۔ سانحہ کربلا کی یاد ماہِ محرم کی چاند رات سے شدت کے ساتھ شروع ہوجاتی ہے۔ اس سانحہ پر جتنا غم کیا جائے وہ کم ہے، اس لیے کہ جن بزرگوں پر میدان کربلا میں مظالم و مصائب کے پہاڑ ٹوٹے وہ تمام لوگوں کے لیے قابل احترام اور واجب التعظیم ہیں۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ محرم کی دسویں تاریخ یعنی یومِ عاشورا تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت وعظمت والا دن ہے۔

کربلا سے قبل و مابعد وقوع پذیر ہونے والے واقعات جس انداز میں یاد کیے جاتے ہیں، ان کو مراسم عزاداری کہا گیا۔ امام حسینؑ سے محبت اور ان کے احترام کا جذبہ ہمیشہ مسلمانوں خصوصاً شیعوں میں واضح اور نمایاں رہا ہے۔ چنانچہ تعزیہ داری کا کلچر تیسرے امامؑ کی محبت میں معرض وجود میں آیا۔ تاریخ عزاداریؑ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ معزالدولہ دیلمی نے ۳۵۲ھ میں دارالخلافت بغداد میں اعلانیہ عزائے حسینؑ برپا کرنے کا حکم دیا اور شہر کی رونق و آرائش کو کم کرنے اور اظہارِ غم کے لیے بازار اور دروازے بند کرادیئے، باورچیوں کو اس دن کھانا پکانے سے منع کردیا اور شیعہ عورتیں بال کھولے ہوئیں نکلیں۔[1] ۳۶۳ھ میں اسی طرح کا حکم المعزالدین اللہ الفاطمی نے مصر میں جاری کیا اور وہاں بھی عزائے حسینؑ اعلانیہ ہونے لگی۔[2] سرزمین شام میں شہر حلب سے باہر عشرہ محرم میں اظہار حزن و اندوہ کیا جاتا تھا اور گریہ و زاری، نوحہ و ماتم کا شور بلند کیا جاتا تھا، جس کا ثبوت مثنوی مولانا روم کی جلد ششم کے ان اشعار سے ملتا ہے۔

☆ ریڈر شعبۂ تاریخ، شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

۱- تاریخ ابوالفدا، جلد دوم، طبع حسینیہ مصر، ص ۱۰۴، بحوالہ سید سبط الحسن فاضلی بنسوی۔ عزاداری کی تاریخ، نظامی پریس، لکھنؤ ۱۹۴۳ء، ص ۱۰

۲- المقریزی، الخطط، جلد دوم، مطبع النیل، مصر، ۱۳۲۳ھ صفحات ۲۹۱-۲۸۹

روز عاشورا ہمہ اہلِ حلب　　باب انطاکیہ اندر تا بہ شب
گرد آید مرد و زن جمعے عظیم　　ماتم آن خاندان دارد مقیم
تا بہ شب نوحہ کنند اندر بکا　　شیعہ عاشورا برای کربلا[1]

عراق، مصر، یمن، ترکی وغیرہ میں بڑے اہتمام کے ساتھ مجالس کا انعقاد ہوتا ہے۔ افغانستان میں بھی عزاداری بڑے انہماک کے ساتھ کی جاتی ہے۔ کابل میں متعدد امام باڑے موجود ہیں جن میں باقاعدہ ماہ محرم میں عزاداری ہوتی ہے۔ قسطنطنیہ کے محرم کے بارے میں علامہ شبلیؒ نے 'سفر نامۂ بلاد اسلامیہ' میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

مملکت ایران میں ابتدائے اسلام ہی سے تشیع کا غلبہ رہا، اس لیے ایرانیوں میں عزاءِ امام کی کافی اہمیت رہی۔ جب داعی صغیر زید الحسنی نے ۲۵۰ھ میں طبرستان میں اپنی مستقل حکومت قائم کی تو مذہب امامیہ کو بہت عروج ہوا اور عزائے حسینؑ میں بھی کافی رونق ہوئی، انہی بزرگ کے صاحب زادے داعی صغیر محمد بن زید الحسنی تھے جنھوں نے سب سے پہلے مشہد امام مظلوم اور روضۂ جناب امیر علیہ السلام تعمیر کرایا۔[2] ہندوستان سے شیعیت کا تعارف عہدِ خلافت امیرالمومنین علی ابنِ ابی طالبؑ ہی میں ہو چکا تھا، چنانچہ پہلا شیعی مسلمان جس نے سندھ کو فتح کیا، وہ امیرالمومنین کے لشکر کا ایک جوانمرد سپاہی، حارث بن مرہ العبدی تھا جس نے ۳۹ھ کے اوائل میں سندھ کو بحکم امیرالمومنینؑ اسلامی فتوحات میں شامل کیا۔[3] امام جعفر صادق علیہ السلام کے حلقۂ درس میں جہاں فلسفۂ آل محمد اور علوم قرآنی کی نشرواشاعت کی جارہی تھی، چند ہندوستانی بھی ملتے ہیں۔ فرخ سندھی، خلاد سندھی، بزار، ابان بن محمد سندھی، طلحہ بن زید ابوالخزرج ہندی، یہ وہ لوگ ہیں جن کا شمار روات و اصحاب امام جعفر صادق علیہ السلام میں ہے۔[4] اسی طرح صباح بن نصر ہندی بھی قابل ذکر ہیں، جو احکام و مسائل امام رضا علیہ السلام کی تبلیغ کرتے تھے۔ یقیناً یہی وہ لوگ ہیں جو ہندوستان میں شیعیت کو متعارف کرنے والے ہوسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ''المقدسی'' کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ شیعہ مذہب کا ہندوستان میں اثر ورسوخ تقریباً تیسری صدی ہجری کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ہو چکا تھا۔[5] اسی زمانے میں عزاداری حسینؑ کا قیام ہندوستان میں بھی ہوا ہوگا، یہ بھی

۱- مثنوی مولانا روم، جلد ششم بمبئی ۱۳۰۸ھ، ص ۵۷۰　۲- سبط الحسن، عزاداری کی تاریخ، نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۴۷ء، ص ۱۳
۳- البلاذری، فتوح البلدان، ذکر فتوح السندھ، مصر، ص ۴۳۸　۴- سبط الحسن، عزاداری کی تاریخ، ص ۲۸
۵- المقدسی، احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم، ۱۹۰۹ھ، ص ۴۸۱

ثبوت ملتا ہے کہ چھٹی صدی ہجری میں شیعوں کا ایک تبلیغی مشن ہندوستان میں شیعیت کی اشاعت کر رہا تھا۔[۱] اسی زمانہ میں ملاعلی نامی[۲] ایک فاضل شیعہ مذہب کی تبلیغ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مذکورہ شواہد کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ شیعہ ہندوستان میں موجود تھے، لیکن ''تعزیہ'' کا کوئی نشان نہیں ملتا حالانکہ اس زمانہ میں شیعہ سرگرمی کے ساتھ دوسرے مراسم عزا بجا لاتے تھے۔ ۱۴ ویں صدی کے عالم شہاب الدین دولت آبادی، کی کتاب ''ہدایۃ السعداء'' میں رسم عزاء کا ذکر ہے، جو اس زمانہ میں ہندوستان میں رائج تھی۔[۳]

تیرھویں صدی سے سولھویں صدی تک عزاداری امام حسینؑ امام باڑوں میں ہوتی تھی مگر جلوس کا کوئی رواج نہ تھا، اس عہد میں کچھ سلاطین ایسے تھے جن کے دور میں عزاداری امام حسینؑ خفیہ طور پر ہوئی۔ سلاطین دہلی بغداد کے موروثی ملوک کی سرپرستی میں ہندوستان میں سلطان کی حیثیت سے حکومت کر رہے تھے۔ ظاہر ہے ایسی حکومت میں اعلانیہ طور پر عزاداری امام حسینؑ ممکن نہ تھی۔[۴] مغل بادشاہوں کو اہلِ بیتؑ سے عقیدت تھی، اسی لیے انہوں نے عزاداری امام حسینؑ پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ ہمایوں کی ایران سے واپسی پر ایرانی علماء اور امراء بھی اس کے ساتھ آئے اور ان کے لیے مغل حکومت کے دروازے کھول دیئے گئے، جس کی وجہ سے ایرانی علماء کا ہندوستان آنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ہمایوں نے ہندوستان پر دوسری مرتبہ قابض ہونے کے بعد بیرم خاں کو کربلائے معلیٰ بھیج کر ایک ضریح بنوائی تھی، جو قیمتی جواہرات سے تیار کی گئی تھی اور جس کو شاہی محل میں لاکر رکھا گیا تھا۔[۵] اکبر کی 'صلح کل' کی پالیسی بھی عزاداری امام حسینؑ کی نشر و اشاعت میں مددگار ثابت ہوئی، اسی عہد میں شیعہ عالم قاضی نوراللہ شوستری کا بحیثیت قاضی تقرر ہوا[۶] جس کی وجہ سے عزاداری امام حسینؑ کو فروغ ملا۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں بھی ملکی آزادی رہی۔ عہد جہانگیر میں نور جہاں نے تعزیہ داری کے لیے چند مواضعات بحیثیت معافی کے خواجہ معین الدین چشتیؒ کی درگاہ کے لیے مخصوص کردیئے تھے جس کا مقصد عشرہ محرم میں عزاداری کا اہتمام تھا۔[۷] اس کے لیے ایک شاہی فرمان بھی صادر کیا گیا

۱- محمد بن الحسن بن اسفندیار، تاریخ طبرستان، مترجم ای۔ جی۔ براؤن، ای۔ جی۔ ذبلو گب، ۱۹۰۵ء، ص ۶۸
۲- ان کا مزار کھبات میں ہے، بحوالہ سبط الحسن، عزاداری کی تاریخ، نظامی پریس، لکھنؤ ۱۹۴۱ء، ص ۲۹
۳- سید عزیز الدین حسین، تاریخ عہد وسطی، ادارہ ہمدانیہ، علی گڑھ، دسمبر ۲۰۰۴، ص ۲۰۶ ۴- سبط الحسن، حوالہ مذکورہ، ص ۳۴
۵- شوکت علی فہمی، ہندوستان پر مغلیہ حکومت، دین دنیا پبلشنگ کمپنی، دہلی، ص ۳۹
۶- علی حسین رضوی، تاریخ شیعان علی، امامیہ اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۲، ص ۴۴۵
۷- مولانا عبدالواحد نبیرہ مولانا عبدالعلی فرنگی محلی، ازالۃ الاوہام، بحوالہ سبط الحسن حوالہ مذکورہ، ص ۳۶

جس میں عزاداری کا خصوصیت سے ذکر ہے۔ اس فرمان کے مطابق درگاہ میں تعزیہ رکھا جاتا تھا۔ اور مجلسیں ہوتی تھیں، مغلیہ عہد میں اعلانیہ تعزیہ داری کا ثبوت درج ذیل عبارت سے ملتا ہے۔

''مراسم تعزیہ داری امام علیہ السلام از صدہا سال جاری و مروج است و در زمان سلاطین اہلِ اسلام و متشرع مانندِ جلال الدین اکبر، جہانگیر و عالمگیر اورنگ زیب وغیرہ کہ درتمام ملک خود نافذ الامر کلی بودند، لوازم تعزیہ داری بوجہ احسن بتقدیم رسد''۔[۱]

''مراسم تعزیہ داری صدہاسال سے جاری اور مروّج ہیں۔، جلال الدین اکبر، جہانگیر اورنگ زیب کے زمانے میں بھی تعزیہ داری ہوتی تھی، یہ وہ بادشاہ تھے جو پورے ہندوستان پر قابو رکھتے تھے اور ان کے احکام نافذ تھے۔ اس زمانے میں تعزیہ داری کے رسوم بحسن وخوبی ادا کیے جاتے تھے''۔

دکن میں بہمنی سلطنت، خصوصاً احمد شاہ بہمنی کے زمانے میں ایرانیوں کا زور تھا، وہ اپنے معتقدات میں پختہ تھے اور اور ایک جگہ بیٹھ کر واقعۂ شہادت سنتے تھے، گویا یہ مجالس کے انعقاد کا ابتدائی دور تھا۔[۲] جب عزاداری کا فروغ ہوا تو عزاخانوں کی تعمیر ہوئی اور علم نصب ہونے لگے اور علم کے جلوس نکلنے لگے۔

بہادر شاہ اول اور فرخ سیر کے عہد میں قلعۂ معلیٰ کے اندر عزاداری شروع ہوئی اور کہا جاتا ہے کہ ۱۷۳۸ء میں دہلی میں بیسوں عاشور خانے، مرثیہ گو، مرثیہ خواں، اور سوز خواں موجود تھے[۳] مرقع دہلی ۱۷۷۱ء میں مندرجہ ذیل بیان درج ہے۔

''درگاہ شاہ مرداں میں تیرہ محرم کو ایک مجلس عزا ہوتی ہے، اس مجلس میں دہلی کا کوئی شخص ایسا نہیں جو شرکت نہ کرتا ہو۔ تاحد نگاہ سواریاں ہی سواریاں نظر آتیں، مالدار، غریب، چھوٹے، بڑے غرض کہ سب لوگ ہی شرکت کے لیے یہاں آتے''۔[۴]

مذکورہ بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس وقت عزاداری امام حسینؑ میں دہلی کے تمام لوگ (ہندو مسلم) شرکت کرتے تھے۔

عزاداری صرف شیعہ فرقے کے ساتھ مخصوص نہ تھی، امام حسینؑ کی حقانیت کے بارے میں سارے مسلمان متفق تھے، اس لیے جب ایرانی اثرات کے تحت عزاداری کا رواج ہوا تو تمام مسلمانوں نے

۱- ماہنامہ نیادور، لکھنؤ، جون ۱۹۹۷ء، ص ۲۶ ۲- ایضاً

۳- درگاہ قلی خان، مرقع دہلی، فارسی مخطوطہ سالار جنگ میوزیم، حیدر آباد، ایف اے بی ۸، ۵۶، ۵۷، اوع ۵۸

۴- مرزا جعفر حسین، قدیم لکھنؤ کی آخری بہار، قومی کونسل، نئی دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۳۲۳

اس میں حصہ لیا اور پھر جب اس نے ثقافتی قوت حاصل کرلی تو غیر مسلم بھی اچھی خاصی تعداد میں حصہ لینے لگے۔

ہندوستان میں تعزیہ کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی اس کے بارے میں قطعی طور پر کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ایک روایت زبان زد اور مشہور ہے جس کو تواتر کا مرتبہ دیا جاسکتا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کا موجد امیر تیمور صاحب قران ہے لیکن اس کا تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امیر تیمور ہر محرم میں امام حسینؑ کے مزار پر حاضر ہوکر سوگ نشیں ہوتا تھا۔ جب ہندوستان پر حملہ کرنے کے دوران ہی محرم کا چاند نظر آیا اور اس کے لیے مرقد مبارک پر پہنچنا ناممکن ہوگیا، تب اس نے اپنے مشیروں سے استصواب کیا اور ان کی رائے پر عمل کرتے ہوئے روضۂ مطہر کی شبیہہ تیار کرائی اور اسی کے حضور گریہ کناں ہوکر اپنی عقیدت مندی کو آسودہ کیا، اس طرح تعزیہ داری کی بنیاد قائم ہوئی۔[۱]

اودھ کے فرمانروا ایرانی النسل اور عقیدتاً شیعہ تھے، ان کو امام حسینؑ کی عزاداری سے بہت شغف تھا۔ جب ۱۷۳۴ء میں برہان الملک سعادت خاں نے اودھ کے صوبیدار کا چارج لیا تو اس زمانہ میں جونپور مشرقی ہندوستان کے شیعوں کا مرکز تھا اور یہاں سوزخوانی اور روضہ خوانی کا رواج عام تھا۔[۲] آصف الدولہ نے جب لکھنؤ کو دارالحکومت بنایا تو کچھ ہی مدت کے بعد درباری مذہب شیعت قرار پایا، اور بہت جلد میر دلدار علی جو بعد میں مجتہد ہوئے، مذہبی امور میں صاحب اقتدار ہوگئے۔ انہوں نے عزاداری کی ترویج ہی نہیں کی بلکہ اس میں اصلاحات بھی کیں،[۳] واجد علی شاہ کو محرم اور عزاداری سے اتنا انہماک تھا کہ وہ شب عاشورہ عوام کے گھروں میں جاکر تعزیہ خانوں کی زیارت کرتے اور ہر مقام پر کچھ چڑھاوا چڑھاتے۔ اس طرز عمل کی وجہ سے لکھنؤ میں گھر گھر تعزیہ داری کو فروغ ہوگیا تھا۔[۴]

آٹھویں صدی کے وسط سے پورب میں اودھ سے آگے بڑھ کر جون پور وظفر آباد کے علاقے میں مسلم نو آبادیوں نے وسعت پائی اور بعد میں خواجہ جہاں نے دہلی سے سلطان الشرق کا خطاب پاکر جون پور کو اپنا مرکز بنایا،[۵] خواجہ جہاں کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے مبارک شاہ شرقی نے خود مختاری کا اعلان کردیا اور اس طرح پورب کی آزاد و خودمختار سلطنت کی بنیاد پڑی۔ مبارک شاہ کے انتقال کے بعد ابراہیم شاہ شرقی نے جونپور کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس نے جونپور میں چالیس برس

۱- ماہنامہ نیا دور، لکھنؤ جون ۹۷ء، ص ۲۷ ۲- مرزا جعفر حسین حوالہ مذکورہ ۳۲۳ ۳- ایضاً ص ۳۲۴
۴- سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۱۹۹۹ء، ص ۹ ۵- ایضاً ص ۵

حکومت کی اور اس کے زمانہ میں لاہور، ملتان اور دلی سے مرکز علم وفن منتقل ہوکر پورب کے اطراف میں آ گیا اور علم وفن کے چرچے روز بروز ترقی کرتے گئے۔ یوں تو سارے سلاطین شرقی اثنا عشری عقیدہ رکھتے تھے، لیکن سلطان ابراہیم شاہ اس میں ممتاز تھا۔

مغلوں کے عہد میں سرکاروں کی جو تقسیم تھی اس سے پتہ چلتا ہے کہ سرکار جونپور صوبہ الٰہ آباد کے تحت تھی جو اس زمانے میں ۴۱ محال (پرگنوں) پر منقسم تھی۔ ان پرگنوں کے قصبوں کے جو نام ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ پورا ضلع اعظم گڑھ، ضلع بلیا کا پرگنہ سکندر پور، غازیپور کے پرگنے، شادی آباد اور فیض آباد کے پرگنے، چاندی پور، بڑہز، ٹانڈہ، سرہر پور وغیرہ سرکار جونپور میں شامل تھے۔[۱] جہاں تک اعظم گڑھ کا تعلق ہے تو یہ بعد کی بات ہے، البتہ اس کے اکثر مردم خیز قصبات پرانے ہیں جو پہلے جونپور میں شمار ہوتے تھے، اس لیے خطے کے زیادہ تر مشاہیر جونپوری مشہور ہوئے۔

اعظم گڑھ ۱۸ دسمبر ۱۸۳۲ء کو مستقل ضلع قرار پایا اور اس کے کلکٹر کا نام مسٹر ٹامس تھا جس کی نامزدگی ۱۸۳۲ء میں ہوئی تھی[۲] ضلع اعظم گڑھ اگرچہ انگریزی عہد کی پیداوار ہے لیکن اس کا نام تاریخ عہد مغلیہ سے ملتا ہے۔ اعظم گڑھ کے راجاؤں میں سے ایک راجہ اعظم تھے، انہوں نے اعظم گڑھ کے محلّہ کوٹ میں ایک قلعہ بنوایا اور اسے اپنے نام سے منسوب کیا۔ چونکہ گڑھ کے معنی قلعہ کے ہوتے ہیں، اسی لیے اس کا نام اعظم گڑھ پڑ گیا، راجہ اعظم کے خاندان کا پہلا شخص جہانگیر کے عہد میں مسلمان ہوا تھا۔ ''روایت یہ ہے کہ جہانگیر کے زمانہ میں اس خاندان کا مورثِ اعلیٰ آگرہ جاکر مسلمان ہوگیا تھا، جہانگیر نے اس کی بڑی قدر کی اور دولت خاں کے خطاب سے اس کو سرفراز کیا اور چوبیس پرگنوں کی ریاست بھی عطا کی، یہ چوبیس پرگنے زیادہ تر موجودہ اعظم گڑھ میں واقع تھے۔ تزک جہانگیری کے سال چہارم میں دولت خاں نام کے ایک امیر کا ذکر موجود ہے، شہنشاہ لکھتا ہے:

''دولت خاں بہ فوج داری صوبہ الٰہ آباد و سرکار جونپور تعین یافتہ بود، آمدہ ملازمت نمود بر منصب او کہ ہزاری بود، پانصدی افزودہ شد''[۳]

مذکورہ فرمان کی نقل انگریزوں کی ابتدائی عمل داری میں شامل کر ڈسٹرکٹ گزیٹر میں محفوظ ہے۔ راجہ دولت خاں لاولد فوت ہوئے، ان کے بعد ان کے بھتیجے ہرنس ریاست کے مالک بنے۔ آگے

۱- قاضی اطہر مبارکپوری، تذکرہ علماء مبارک پور، دائرہ سلفیہ، مبارک پور، ۱۹۷۴ء، ص ۲۲

۲- سید سلیمان ندوی، حوالہ مذکورہ ص ۵۲ ۳- ایضاً ص ۵۳

چل کر اسی خاندان سے ایک نامور شخص بکرما جیت پیدا ہوا، اس نے بھی اسلام قبول کرلیا، اس کے دو بیٹے ہوئے، اعظم خاں اور عظمت خاں، اعظم خاں، نے ۱۶۶۵ء میں اعظم گڑھ کی بنیاد ڈالی اور عظمت خاں نے اپنے نام سے عظمت گڑھ بسایا۔[۱] اتر پردیش کے مشرقی اضلاع میں اعظم گڑھ کو علمی، سیاسی اور تمدنی لحاظ سے ایک اہم مقام حاصل ہے۔ موجودہ اعظم گڑھ کے مشہور قصبات میں مائل، سرائے میر، نظام آباد، اور مبارک پور ہیں، جہاں شیعہ سنّی کے علاوہ ہندو مذہب کے ماننے والے بھی کثیر تعداد میں ہیں اعظم گڑھ میں کچھ ایسے گاؤں ہیں جہاں خالص شیعہ آبادی ہے۔ جیسے شیولی، پتاڑپور، برسرائمہ، پاری پٹی، خطیب پور، مٹھن پور، فتن پور، شاہ دیوئت، شیخ پورہ، غوث پوراور بجہر وغیرہ۔ان کے علاوہ اعظم گڑھ کے اور گاؤں بھی ہیں جن میں شیعہ آباد ہیں اور یہاں شیعوں کے ساتھ اہلِ ہنود اور برادران اہل سنت عزاداریِ امامِ مظلوم میں بے حد عقیدت رکھتے ہیں، ان کی اس عقیدت کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ عزا داری کا تعلق کسی خاص فرقے یا طبقے سے ہے۔

عزاداری کے تعلق سے قصبہ مبارک پور، موضع برسرائمہ، شیخ پور، غور پور، کھپرا گاؤں، بجہر، شیولی، پتاڑپور، شاہ دیوئت، ناہر پور اور ڈوراں گاؤں قابل ذکر ہیں۔

قصبہ مبارک پور

کٹرا مانک پور (الہ آباد) کے راجہ سید مبارک شاہ نے مغل بادشاہ ہمایوں کے زمانہ میں مبارک پور آباد کیا، اور یہاں کے بعض خاندانوں کو مبارکپور لے جاکر مستقل طور پر بسایا۔ مبارک پور کو کٹرا مانک پور سے علمی ، دینی روحانی تعلق کے ساتھ ساتھ صنعت پارچہ بافی کے تعلق سے بھی ایک نسبت رہی ہے، ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں مبارک پور کے ریشمی کپڑے، برطانیہ اور عرب ممالک تک جاتے تھے۔[۲] مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ کے لیے قلب و روح کی حیثیت رکھتا ہے، صنعت و حرفت، صحافت، تصنیف و تالیف کے میدان میں اس قصبے کو اعظم گڑھ کے دیگر قصبات پر فوقیت حاصل ہے۔ حدیث، فقہ، علم کلام، منطق، فلسفہ، سوانح، ادب، مناظرہ ہیئت وغیرہ کے موضوعات پر یہاں کے اہل قلم نے عربی، فارسی اور اردو زبان میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں جو کہ عالم اسلام میں مقبول ہوئیں،[۳] قصبہ مبارک پور کی آبادی بہت پرانی ہے، یہاں پر عزاداری کی روایت بہت قدیم زمانے سے چلی

۱- قاضی اطہر مبارک پوری، حوالہ مذکور، ص ۲۹ ۲- ایضاً ص ۵۲

۳- ڈاکٹر حبیب اللہ اعظم گڑھ کا علمی ادبی اور تاریخی پس منظر، اسلامک بک فاؤنڈیشن، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۷۷

آ رہی ہے۔

نوابانِ اودھ کے عہد میں اعظم گڑھ کے قریات و قصبات میں تعزیہ داری کو بہت فروغ حاصل ہوا، چونکہ نوابان اودھ عزاداری امام حسینؑ و دیگر شہداء کربلا کی یادگار قائم کرنے کی طرف خصوصاً توجہ دیتے تھے، اس لیے اس عہد میں بہت سے سنّی گھرانوں نے بھی جاگیرومعافی اور دوسری مراعات حاصل ہونے کی امید میں امام باڑے وغیرہ تعمیر کراکے تعزیہ داری شروع کردی اور مجالس کے اثر سے مرثیہ خوانی، سوز خوانی اورنوحہ وسلام کوعوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔

نوابان اودھ کے زمانے میں مولانا رمضان علی شاہ پنجاب کے علاقہ سے مبارک پور آئے، وہ اثنا عشری مذہب کے عالم و مبلغ تھے، یہاں آ کر انہوں نے موجودہ مدرسہ باب العلم کے پاس ایک شاندار امام باڑہ، نواب شجاع الدولہ کے عہد میں تعمیر کرایا اور پھر نواب سعادت علی خاں کے عہد میں اسی امام باڑے کے اندر چبوترہ اور پنجہ بنوایا ۲۹ امام باڑے کے برآمدے میں محراب کے دائیں بائیں دونوں جانب مچھلی کی تصویریں بنی ہوئی ہیں اور کلمہ تہادت کے بعد یہ عبارت درج ہے۔

علی ولی الله و محمد رسول الله، لا فتی الّاعلی لا سیف الا ذو الفقار، لااله الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین، یا ابا عبدالله یا لیتنی کنت معکم فافوز فوزاً عظیماً

بلغ العلیٰ بکماله　　کشف الدجیٰ بجماله
حسنت جمیع خصاله　　صلّوا علیه وآله

نادِ علیاً مظهر العجائب و الغرائب　　انا مدینة العلم و علی بابها

محراب کے اوپر ۱۲۰۹ھ کندہ درج ہے اور اندر شمال مغرب کے گوشہ میں پنجہ اور اس کا چبوترہ ہے، جس پر ۱۲۱۶ھ اور مندرجۂ ذیل اشعار درج ہیں۔

یا علی کیست کہ شرمندۂ احسانِ تو نیست　　شیر خوانِ کرم کیست کہ مہمانِ تو نیست
چہ دیر است اے شفیعِ روزِ محشر　　ہمیں پنجہ ہمین است حوضِ کوثر

مبارک پور کے محلّہ کٹرہ میں بھی ایک قدیم امام باڑہ ہے، مقامی باشندوں کی روایت کے مطابق نواب واجد علی شاہ کی ایماء پر ان کے کسی وزیر نے ۱۲۰۴ھ میں تعمیر کرایا تھا۔ امام باڑے میں کل ۹ گنبد ہیں، مرکزی گنبد بڑا ہے، عمارت چونے اوراینٹ کی بنی ہے۔ اس پر ایک کتبہ بھی ہے جس پر

درج ذیل عبارت لکھی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم	سبحان اللہ العظیم
گفت تاریخ ہاشم مرقال	شد بنا روضۂ امام بحق
	۱۲۰۴ھ
ہست اللہ شاہد	خادم روضۂ بندہ واحد
	۱۲۰۴ھ

آج کل اس امام باڑے کے متولی کو لے کر تنازعہ ہے، اور مقدمہ اعظم گڑھ سول کورٹ میں زیر سماعت ہے۔ اس امام باڑہ میں عزاداری کی رسم ادا کرنے شیعہ سنی دونوں آتے تھے، لیکن مقدمہ شروع ہوجانے کے باعث ۲۲ سال تک شیعہ وسنی دونوں نے جلوس وعزاداری کو موقوف کیے رکھا۔ مقامی لوگوں نے بتایا کہ اب دونوں فرقوں کے لوگ امام باڑہ میں آنے لگے ہیں۔

جس زمانہ میں رمضان علی شاہ مبارک پور آئے تھے، اسی زمانے میں مسلک امامیہ کی تبلیغ و اشاعت کے لیے شیخ سیف علی بھی باہر سے آئے اور انہوں نے امام باڑہ رمضان علی شاہ کے بالمقابل جنوب میں ایک امام باڑہ تعمیر کیا، جو بعد میں منہدم ہوگیا۔ یہ وہی دور ہے جس میں چراغ علی مبارک پور میں سکونت پذیر ہوئے اور انہوں نے شیعہ عقائد کی ترویج کے لیے جدوجہد کی، ایام محرم کی مجالس ومراسم عزاداری کا سلسلہ جاری کیا۔

قصبہ مبارک پور کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہاں سید کوئی نہیں ہے، جہاں تک عزاداری کی روایت کا معاملہ ہے تو یہاں کے سنی بھی تعزیہ اٹھاتے ہیں اور ان کے علاوہ جلوس بھی نکلتا ہے۔ محلہ پرانی بستی (لال چوک) محلہ پورہ رانی، اسلام پورہ سے ۸ محرم اور ۱۰ محرم کو سنّی علم اور تعزیہ اٹھاتے ہیں۔ سنیوں کی ایک انجمن ''اظہار حسینی'' کے نام سے ہے، جس کے ممبران شیعوں کی طرح علَم اٹھاتے ہیں اور جلوس بھی نکالتے ہیں۔ ہندو عقیدت سے نذر ونیاز کراتے ہیں لیکن جلوس نہیں نکالتے۔

مذکورہ امام باڑوں کے علاوہ قصبہ مبارک پور کے دوسرے امام باڑے درج ذیل ہیں۔

محلہ پورہ باغ	امام باڑہ دولھا بابا
محلہ پورہ دلہن	امام باڑہ محلہ پورہ دلہن
پورہ صوفی	ایوان حسینی رعلمدار حسینی

حسینی باغ	عزاخانہ زہرا
محلّہ شاہ محمد پور	امام باڑہ سیف علی شاہ
پورہ خضر	بیت العزا
پورہ خواجہ	ایوان ابوطالب
محلّہ پورہ رانی	امام باڑہ چٹان
پورہ دیوان	امام باڑہ پھاٹک والا
پرانی بستی	امام باڑہ زینبیہ

پورے قصبے میں ہلال محرم نمودار ہوتے ہی مجالس کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے اور یہ سلسلہ ۸ ربیع الاول تک چلتا ہے۔

قصبہ مبارک پور میں بہت سی انجمنیں بھی ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

۱- انجمن انصار حسینی (رجسٹرڈ) ۱۹۳۹ء محلّہ شاہ محمد پور، موجودہ سکریٹری حفاظت حسین

۲- انجمن معصومیہ، قائم شدہ ۱۳۶۱ھ، موجودہ سکریٹری غم خوار حسین

۳- انجمن انصار حسینی قدیم، محلّہ پورہ باغ موجودہ سکریٹری خورشید احمد پسر حاجی حماد

۴- انجمن عزادار حسینی، شاہ محمد پور، موجودہ سکریٹری حیدر علی

قصبہ مبارک پور کے بزرگ حضرات سے گفتگو کرنے پر یہ واضح ہوا کہ ۱۹۵۰ء تک مجلسوں میں نصف سے زائد سنّی رسوم عزاداری میں شرکت کرتے تھے اور مسلکی ہم آہنگی پائی جاتی تھی، سنّیوں میں بہ نسبت شیعوں کے نوحہ وغیرہ سننے کا ذوق زیادہ تھا اور محرم میں جو جلوس نکلتے تھے، ان میں بھی سنیوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی، لیکن اب حالات بدل چکے ہیں، مجلسوں میں صرف دو چار سنی آجاتے ہیں، اس کی وجہ مقامی لوگوں نے یہ بتائی کہ سنّی علما نے عزاداری کو بدعت قرار دیا ہے، جس کی وجہ سے ان میں دلچسپی کم ہوئی پھر بھی قصبہ مبارک پور کے تقریباً دس فیصد سنّی عزاداری کی روایت پر قائم ہیں۔

برسرا ائمہ

برسرا ائمہ ضلع اعظم گڑھ سے مغرب کی جانب ۱۵ کلومیٹر کی دوری پر سادات زمینداروں کا گاؤں ہے، اس گاؤں میں شیعہ سنّی اور ہندوؤں کی ملی جلی آبادی ہے۔ یہاں عزاداری کی روایت بہت زمانہ سے چلی آرہی ہے، اہل سنت بھی عزاداری میں حصہ لیتے ہیں، ان کے اپنے امام چوک ہیں، شب عاشور

اور روزِ عاشور ان کے دو تعزیے پیش پیش ہوتے ہیں اور یہ دونوں برسراائمہ کے پولس تھانہ کپتان گنج کے ریکارڈ میں درج ہیں۔ اس کے علاوہ منت کے لیے ہندوؤں کے چھوٹے چھوٹے تقریباً چالیس تعزیے نکلتے ہیں، ان کا ریکارڈ بھی تھانے میں درج ہے۔ اس گاؤں کا بنسورام۔ ہریجن ۸ ویں محرم کو علم نکالتا ہے او رتقریباً مجلس کا انعقاد بھی کرتا ہے۔ تبرک بھی تقسیم کراتا ہے۔ اس کے علاوہ پلٹورام، راجدیو لوہار اور رام دھنی خود تعزیہ اٹھاتے ہیں۔

برسراائمہ کے شیعہ محرم کے مہینہ میں تمام رائج رسوم ادا کرتے ہیں اور مرکزی امام باڑے سے لکڑی کی ضریح نویں اور دسویں محرم کو باہر نکالتے ہیں۔ اس کے علاوہ الاؤ پر علم لے کر چلنے کی رسم بھی ادا ہوتی ہے، جس کی خاص بات یہ ہے کہ سنی لڑکے الاؤ پر علم لے کر چلتے ہیں اور آگ کو راکھ کر دیتے ہیں، برسراائمہ سے لگی ہوئی خالص سنیوں کی ایک بستی دیوریا ہے، یہاں سے بھی تعزیے نکلتے ہیں اور حسینی باغ میں آتے ہیں، یہاں دیوریا کے سنی اور برسراائمہ کے شیعہ اکٹھا ہوتے ہیں اور مل جل کر نوحہ و ماتم کرتے ہیں، رواداری کی یہ عظیم مثال ہے۔

برسراائمہ میں بشمول صدر امام باڑہ کل پانچ امام باڑے ہیں۔ اس موضع کے مشہور لوگوں میں سید محمد صادق، سید تقی الحسن، سید ناصر رضا، سید حسن عباس، سید نظر حسن، سید علی اکبر رضوی، مقیم حال پاکستان، وغیرہ ہیں۔ آخرالذکر کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور کبھی کبھی پاکستان سے اعظم گڑھ آتے ہیں۔ انہوں نے ہی برسراائمہ کی قدیم جامع مسجد کی تعمیر نو ۲۰۰۰ء میں اپنے پیسے سے کرائی۔

یہاں کے بزرگوں نے انجمن اصغریہ قائم کی تھی۔ ۱۹۷۶ء میں انجمن تسکین فاطمہ قائم ہوئی جس کے سرپرست سید تقی الحسن ہیں۔ اس کے علاوہ اس گاؤں میں ایک باب الحوائج ہے جو سید نظر صاحب، سید محمد تقی اور سید ناظر حسن کی ملکیت ہے۔

بارگاہِ حسینی: یہ تقریباً دو سو سال پرانا امام باڑہ ہے۔ جس کی تجدید ۹ فروری ۱۹۶۷ء کو ہوئی، اس کے متولی سید محمد صادق ہیں، اس کے صدر دروازے پر مندرجہ ذیل شعر کندہ ہے:

یہ ارض پاک ہے سب احترام کرتے ہیں　　یہاں فرشتے بھی انجم سلام کرتے ہیں

اسکے ساتھ ہی امام باڑے کے اندر یہ قطعہ تحریر ہے:

وقار خانۂ کعبہ، بہار خلد بریں　　شریک مرضی رب، حامل کتاب مبیں

بقاءِ دینِ نبیؐ، فخرِ آسمان و زمیں　　مرے حسینؑ ترا مثل دو جہاں میں نہیں

بارگاہ حسینی کے اندر دیواروں پر کربلا کے ۷۲ شہداء کے اسمائے گرامی بھی درج ہیں۔ اس میں مجالس کا انعقاد بالالتزام ہوتا ہے۔

اس میں یہ شعر کندہ ہے۔

حسینیت کی، علم، تعزیہ کی بات کرو　　عزاء کے فرش پر آؤ، عزا کی بات کرو

شیخ پورہ، غوث پور

یہ موضع شہر اعظم گڑھ سے ۱۵ کلومیٹر مغرب اور قصبہ نظام آباد سے ۵ کلومیٹر جنوب مغرب میں ایک ندی کے کنارے واقع ہے۔ بستی کے متعلق یہاں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ تین سو سال قبل آباد ہوئی اور اس کے بانی شیخ محمد حسام تھے، جو اس گاؤں کے زمیندار تھے۔ اس موضع میں شیعہ سنی کے علاوہ ہندوؤں کی مختلف ذاتی کے لوگ بھی آباد ہیں اور اس کی کل آبادی تقریباً ڈھائی تین ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ شیخ پورہ کے باہری حصے میں سادات کے گیارہ گھر اور غیر سید شیعوں کے ۶ گھر آباد ہیں اور ان لوگوں نے اپنی آبادی کا نام غوث پور رکھا ہے۔ اسی وجہ سے یہ موضع دوہرے نام سے جانا جاتا ہے۔[1] اس موضع میں شیخ محمد حسام نے ایک مسجد تعمیر کرائی تھی، جس پر سن تعمیر ۱۱۱۱ھ کندہ ہے، مسجد بڑی خستہ حالت میں ہے۔ اس مسجد میں شیعہ سنی دونوں نماز ادا کرتے ہیں، مسجد کے صحن میں اس گاؤں کے بانی شیخ حسان صاحب مدفون ہیں اور یہاں ایک چوک امام حسین علیہ السلام سے منسوب ہے۔ اس بستی میں کل چار امام باڑے ہیں۔

۱- حکیم احسان حسین کا امام باڑہ: یہ امام باڑہ تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے تعمیر ہوا تھا، اب زمیں بوس ہو چکا ہے، صرف آثار باقی ہیں۔ اس امام باڑے کی عزاداری جھنکو حلال خور کرتے تھے۔

۲- حکیم احسان قصاب کا امام باڑہ: یہ امام باڑہ حکیم قصاب کے بزرگ جناب سدھو نے شیخ محمد حسام کے زمانہ میں تقریباً ڈھائی سو سال قبل تعمیر کرایا تھا۔

۳- سید شبیہہ احسن کا امام باڑہ: اس کی تعمیر ۲۳ سال قبل ہوئی۔ اس کی تعمیر سید شاہ رضا نے کرائی۔ طرز تعمیر اور وسعت کے لحاظ سے ایک بڑا اور خوبصورت امام باڑہ ہے۔

اس بستی کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں کوئی اراضی وقف نہیں ہے، عزاداری سے متعلق تمام امور جیسے مجلس، ماتم جلوس، تعزیہ داری وغیرہ عزادار مل جل کر خود اپنے وسائل سے کرتے ہیں۔

۱- شیعہ عزا نمبر لکھنؤ ۱۴۰۸ھ

ایام عزا میں میں مجالس ہوتی ہیں، علم، ذوالجناح اور تابوت کا جلوس بھی نکلتا ہے اور شام غریباں کی مجلسیں بھی امام باڑوں میں ہوتی ہیں، زنانی مجلس کا انعقاد مستورات کرتی ہیں اور ان مجالس کی ذاکری بھی انہیں سے متعلق ہے، نوحے کے لیے باہر سے خواتین بھی بلائی جاتی ہیں۔ اس موضع میں عزاداری بحسن وخوبی برپا کی جاتی ہے۔ اس موضع میں کوئی زیارت گاہ نہیں ہے۔ بستی میں کربلا کا نہ ہونا مومنین کی عدم دلچسپی کا ثبوت ہے۔ اس موضع کی عزاداری کو بحسن وخوبی اختتام کو پہنچانے میں انجمن یادگار حسینی کے اراکین وعہدیداران کا اہم حصہ ہے۔

کھپرا گاؤں اور بجہر [1]

یہ دونوں گاؤں ریلوے اسٹیشن سرائے میر کے شمال میں واقع ہیں، یہاں بھی سادات کی آبادی ہے، کھپرا گاؤں کی مقتدر ہستی میر مرتضیٰ حسین، رئیس کھپرا گاؤں تھے یہ نہایت ہی متقی و پرہیز گار تھے، وہ عزاداری کا اہتمام کرتے تھے۔ یہاں عزاداری میں مسلمانوں کا ہر طبقہ شامل ہوتا ہے۔

کھپرا گاؤں سے آگے مرزاپور ہوتے ہوئے اور سرائے میر ریلوے اسٹیشن سے تقریباً ۱۱ کلومیٹر دور بجہر آباد ہے جہاں سادات کی آبادی ہے، یہ لوگ میر حسرت علی مرحوم کی اولاد میں ہیں۔ یہاں ۱۹۳۴ء میں خان بہادر سید ضامن حسین نے مسجد، امام باڑہ تعمیر کروایا، اس امام باڑے میں مجالس عزا برپا کی جاتی ہیں خاص کر ۴ محرم کو ہر سال شب بیداری ہوتی ہے، جس میں بیرونی انجمن ہائے ماتمی خصوصاً بنارس کی انجمنیں شرکت کرتی ہیں اور ماتم وگریہ کرتی ہیں۔ پانچویں کا جلوس بڑی دھوم سے اٹھایا جاتا ہے۔ خان بہادر کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری ان کے فرزندان سید محمد عباس پی سی ایس اور سید محمد حسینی نبھاتے رہے۔ ان دونوں کے انتقال کے بعد اب ان کی اولادیں اور داماد عزائے حسینؑ برپا کرتی ہیں۔

۵ محرم کی عزاء وجلوس کا انتظام سید حسن ولد سید حامد حسین مرحوم کرتے تھے۔ اب یہ ذمہ داری ان کے فرزندان میر حسن مہدی، سید سبط مہدی سید حیدر مہدی اور سید کلب مہدی انجام دے رہے ہیں۔ کلب مہدی اور سید تقدیر الحسن کلن سیٹھ نے گاؤں کے دوسرے افراد کے تعاون سے ایک درگاہ حضرت عباسؑ اور ایک امام باڑہ حسینؑ مظلوم کی تعمیر بھی اسی گاؤں میں کروائی ہے، جہاں عقیدت مند زیارت و دعا کے لیے آتے ہیں۔ یہ دونوں درگاہیں ایک دوسرے کے مقابل تمام تر حسن تعمیر کے ساتھ

۱- بحوالہ پروفیسر شاہ محمد وسیم

ہر دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد گھروں میں اپنے اپنے امام باڑے ہیں جو محرم کا چاند نمودار ہوتے ہی سجا لیے جاتے ہیں اور عشرہ بھر ماتم ہوتا ہے۔ بارہ محرم کو بعد سوئم امام مظلوم سوگ اتارا جاتا ہے۔ سرائے میر کے پچھم میں موضع رسول پور واقع ہے۔ یہاں بھی سادات کی آبادی ہے۔ ایام عزاء میں یہاں بھی ماتم و مجلس کا انتظام خلوص و عقیدت کے ساتھ انجام پاتا ہے۔

موضع شیولی

اعظم گڑھ شہر کے مغرب میں ۵ کلومیٹر کی دوری پر شیولی واقع ہے، یہاں شیعہ سنی دونوں آباد ہیں۔ اس گاؤں میں تقریباً ۲۰۰ شیعہ گھر ہیں۔ اس گاؤں کے بانی سید محی الدین بن اوسط علی تھے۔ گاؤں میں ۲۲ امام باڑے ہیں، عشرہ محرم میں پورے دس دن ۲۴ گھنٹے مجالس کا سلسلہ جاری رہتا ہے، چاند رات سے جلوس کا سلسلہ بھی شروع ہوجاتا ہے اور ۲۰ محرم تک بلاناغہ کسی نہ کسی امام باڑے سے جلوس برآمد ہوتا ہے۔

ہلال محرم کے نمودار ہوتے ہی عشرے کے استقبال کے لیے امام باڑہ محمد غفور مرحوم سے علم مبارک برآمد ہوتا ہے اور دوسری محرم کو یہاں سے تابوت برآمد ہوکر پورے گاؤں کی گشت کرتا ہوا، اسی امام باڑے پر آ کر ختم ہوجاتا ہے۔ چار محرم کو تابوت، پانچ محرم کی شب میں ذوالجناح اور چھ محرم کی شب میں تابوت جناب قاسم برآمد ہوتا ہے اور الاؤ پر ماتم ہوتا ہے۔ اسی طرح چھ محرم کو امام باڑہ محمد قاسم سے علم مبارک برآمد ہوتا ہے، سات محرم کو محلہ راجہ پٹی سے علم مبارک برآمد ہوکر پورے گاؤں کی گشت کرتے ہوئے قریب ہی کے گاؤں بھدولی جاتا ہے اور واپس آ کر راجہ پٹی میں ختم ہوتا ہے۔ آٹھ محرم کو دن میں جلوس علم مبارک بھدولی گاؤں سے شیولی آتا ہے اور راجہ پٹی کے امام باڑہ قصر حسینی سے تابوت جناب حضرت عباس برآمد ہوتا ہے، جس میں کربلا کی منظر کشی کی جاتی ہے، ۹ محرم کو تابوت جناب علی اصغر، امام باڑہ قصر حسینی سے برآمد ہوکر کربلا لے جایا جاتا ہے اور شب عاشور ٹونس ندی کے کنارے ایک مجلس ہوتی ہے جس میں ذاکر بیان فرماتے ہیں، اس کے بعد گاؤں کے لوگ خاموش ماتم کرتے ہیں اور پھر اس جلوس کو امام باڑہ محمد غفور پر لے جاکر ختم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یوم عاشورہ کا ایک مخصوص جلوس برآمد ہوتا ہے، جس میں گاؤں کے تمام لوگ شریک ہوتے ہیں۔ اسی طرح ۱۱، ۱۲، ۱۳ محرم کو بھی جلوس نکلتے رہتے ہیں۔

موضع شاہ دیوئت

شیعوں کا یہ گاؤں اعظم گڑھ شہر سے ۲۰ کلومیٹر کی دوری پر جنوب میں واقع ہے۔ یہ قرب و جوار میں اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اس میں شیعوں کی کثیر آبادی ہے۔ یہ گاؤں جو عزاداری کی روایت سے متعلق کافی شہرت رکھتا ہے، یہاں مجلسوں اور جلوس کا سلسلہ پورے سال رہتا ہے اور ہر ماہ کی پہلی جمعرات کو امام باڑہ جعفریہ سے نوچندی کا علم برآمد ہوتا ہے، جس کا اختتام ۸ بجے شب میں کربلا میں ہوتا ہے۔

ماہ محرم کا چاند نمودار ہونے کے ساتھ ہی ایک جلوس امام باڑہ جعفریہ سے برآمد ہوکر پورے گاؤں کا چکر لگاتا ہوا کربلا تک جاتا ہے، یکم محرم کو ہی موضع کے تمام امام باڑے علم و ضریح، تابوت و تعزیہ سے سج جاتے ہیں اور مجلسیں شروع ہوجاتی ہیں، پورا عشرہ عزاداری میں گزرتا ہے۔

ساتویں محرم اور دسویں محرم کو بڑے جلوس بھی برآمد ہوتے ہیں، ساتویں محرم کا جلوس شہزادۂ قاسم کی یاد میں اتر محال کے امام باڑے سے برآمد ہوتا ہے، آگ کے انگاروں پر ماتم ہوتا ہے، جس کے دیدار کے لیے لوگ حاضر ہوتے ہیں، اس روز جگہ جگہ سبیل کا بھی انتظام ہوتا ہے، جلوس رات میں کربلا پہنچتا ہے، انجمن فروغ عزا اور انجمن فروغ عزا اصغریہ کے ممبران جلوس کے ساتھ نوحہ و ماتم کرتے ہیں۔

موضع پتار

اعظم گڑھ شہر سے چودہ کلومیٹر دور ''پورب و اتر'' کی جانب واقع ہے، سادات کا یہ گاؤں اپنے آباواجداد کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اطراف و جوانب میں عزاداری حسینؑ کے لیے مشہور ہے، چھ سات غیر سید گھرانوں کے علاوہ یہ موضع پچیس تیس سادات کے گھروں پر مشتمل ہے، اس کا تذکرہ ڈسٹرکٹ گزیٹر میں ملتا ہے۔

گاؤں کے بیچ میں ایک چھوٹی خوبصورت مسجد اور دو امام باڑے، جو بڑی پٹی اور چھوٹی پٹی کے نام سے موسوم ہیں، عزاداری کے اہم مراکز ہیں۔ اس گاؤں میں ایک پختہ امام چوک ہے۔ جہاں علم نصب کیے جاتے ہیں، تعزیے رکھے جاتے ہیں، نیز عشرۂ محرم کے دوران مومنین نذرونیاز کرتے ہیں۔

یکم محرم سے مستورات گھروں میں اور مومنین امام باڑوں میں مجالس عزا میں منہمک ہوجاتے ہیں۔ پانچ اور چھ محرم کی رات میں بڑی پٹی کے امام باڑے سے جھولا حضرت علی اصغر و تابوت حضرت علی اکبر علیہ السلام برآمد ہوکر ایک بڑے جلوس کی شکل میں پورے گاؤں میں گشت لگاتے

ہوئے چھوٹی پٹی کے امام باڑے تک رات میں تین بجے کے قریب پہنچتا ہے، رات کے آخری حصہ میں جھولا اور تابوت چھوٹی پٹی کے امام باڑہ میں رکھ دیا جاتا ہے اور مومنین کے یہاں سے ہٹ جانے کے بعد پردہ نشیں خواتین بند امام باڑے میں صبح تک ماتم حسینؑ کرتی ہیں۔[1]

آٹھویں محرم کو بڑی پٹی کے امام باڑہ میں ایک مجلس کا انعقاد ہوتا ہے، جس میں دوسرے موضع کے لوگ بھی شرکت کرتے ہیں۔ چھوٹی پٹی کے مرکزی امام باڑہ کے صحن میں یوم عاشورہ پر تمام عزا خانوں سے تعزیئے لائے جاتے ہیں اور یہاں سے نوحہ خوانی، سینہ زنی اور زنجیری ماتم کے ساتھ ایک بڑے جلوس کی شکل میں دفن گاہ تک پہنچائے جاتے ہیں اور آہ و فغاں و گریہ و زاری کے دوران دفن کردیئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد فاقہ شکنی کا اہتمام ہوتا ہے۔ شامِ غریباں کی مجلس کا خاص اہتمام ہوتا ہے، لوگ عزاخانے میں یوں بیٹھتے ہیں جیسے جنازے کو دفن کرکے آئے ہوں، سب اشک بار ہوتے ہیں، واعظ حالات کربلا بیان کرتا ہے، عزاخانہ میں شمع اور روشنی گل کردی جاتی ہے اور غضب کا گریہ ہوتا ہے۔

ناہر پور

ضلع اعظم گڑھ سے ۴۰ کیلومیٹر دور پورب میں قصبہ مائل کے قریب ایک گاؤں ناہر پور ہے، یہاں شیعہ آباد ہیں اور عزاداری کے تمام مراسم ادا کرتے ہیں، ناہر پور میں ۱۹۹۷ء میں انجمن حسینیہ یووک دل کا قیام عمل میں آیا، اس انجمن کے ممبر ہندو اور مسلم دونوں ہیں۔ اس کے موجودہ سکریٹری کنہیا لال (کیوٹ) ہیں، اس انجمن کے ڈیڑھ سو سے زائد ممبر ہندو ہیں، یہ لوگ باقاعدہ عزاداری کرتے ہیں اور تعزیہ اٹھاتے ہیں، فاقہ بھی کرتے ہیں، یومِ عاشور اس انجمن کے ہندو ممبر فاقہ شکنی کے لیے لائی چنا کا انتظام کرتے ہیں، جبکہ سنی ممبر چائے کا انتظام کرتے ہیں۔ اس انجمن کے بعض ہندو ممبر نوحہ خواں بھی ہیں، جن میں بلدیو پرساد، رام لعل (نائی) ماتا پرساد (بنیا) رام پلٹ (بنیا) گاما پرساد اور بنارسی رام وغیرہ شامل ہیں۔

ماتم کرنے والے لڑکوں کی اچھی خاصی تعداد ہے جو ماتم کرنے کے لیے حیدرآباد، بنگلور، علی پور (بنگلور) احمد آباد، گجرات، بھاؤ نگر، رتلام، بہار، رام پور، بریلی لکھنؤ، گورکھپور، الٰہ آباد وغیرہ جیسے شہروں میں بوجہ روزگار آتے جاتے رہتے ہیں۔

۱۔ شیعہ عزا نمبر لکھنؤ ۱۴۰۷ھ ص ۱۰۴

ڈوراں گاؤں

اعظم گڑھ شہر کے مشرق میں تقریباً بیس کیلومیٹر کی دوری پر سگڑی تحصیل میں گاؤں ڈوراں آباد ہے، یہ خالص ہندو (چوہان) بستی ہے۔ ہر سال محرم کے مہینے میں یہاں کے لوگ تعزیہ اٹھاتے ہیں اور یہ بستی یا حسینؑ کی صدا سے گونج اٹھتی ہے۔اس بستی میں شان و شوکت سے محرم منانے کی ایک دلچسپ کہانی ہے: روایت یہ ہے کہ تین سو سال پہلے اس گاؤں میں دھرمو، بال گووند اور گنجن تین بھائی آپسی میل جول کے ساتھ رہتے تھے، ان تینوں کے والد کا نام ٹوکڑی چوہان تھا، یہ تینوں بھائی لاولد تھے، اولا دکی امید میں ان بھائیوں نے مندر، تیرتھ استھان اور مذہبی مقامات کی زیارت کی، مزاروں پر چادریں چڑھائیں اور منتیں مانیں، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اس لیے تینوں بھائی اور ان کی عورتیں غمگین رہا کرتی تھیں۔ اسی دوران انہیں ایک بزرگ نے امام حسینؑ کی کرب ناک داستان اور واقعہ کربلا سنایا، اس دردناک واقعہ کو سن کر تینوں بھائیوں کی بیویاں رو پڑیں اور انہیں احساس ہوا کہ ان کا غم تو غم حسینؑ سے بہت کم ہے۔ اب انہوں نے پروردگار عالم سے دعا کی کہ اگر اللہ انہیں لڑکا دے تو وہ بھی محرم کے مہینہ میں امام حسینؑ کی یاد میں تعزیہ نکالیں گی۔ اللہ نے ان کی دعا سن لی اور سال بھر کے اندر ہی دھرمو کے یہاں بچہ کی ولادت ہوئی اور اس کا نام 'سالم' رکھا گیا۔ اس کے بعد اور تین لڑکے ہوئے جن کے نام بالترتیب سالم، دینا اور رام دھین رکھے گئے۔ انہیں بھائیوں کی ساتویں پشت کے لوگ اس گاؤں میں آباد ہیں اور کل ۷۰ گھروں کی آبادی ہے۔

لڑکا ہونے کی خوشی میں دھرمو، بال گووند اور گنجن نے عقیدت کے ساتھ خود تعزیہ بنایا، اسے قرب و جوار کے گاؤں میں گشت کرا کر دفن کیا، اس کے بعد سے وہ ہر سال تعزیہ برآمد کرتے رہے۔ اس روایت کو ان کے لڑکوں نے بھی جاری رکھا، جو آج تک مسلسل جاری ہے۔

اس گاؤں کے لوگوں کی زبانی یہ دریافت ہوا کہ اولاً تعزیہ بنانے کا سامان برما اور عرب سے منگایا گیا تھا، سب سے چھوٹے بھائی رام دھین اور اس کے ایک ساتھی نے اپنے ہاتھوں سے ایک تعزیہ تیار کیا جو تین سو سال گزر جانے کے بعد آج بھی محفوظ ہے، تین سو سال قبل کے تعزیے میں جو چاندی کا علم اور سونے کا جھومر لگایا گیا تھا، وہ آج بھی موجود ہے۔ تعزیہ کو بنانے میں کپڑا، ستارہ، چادر، ڈنڈے، پتامبر، چوکی اور چاندی کا استعمال روایت کے مطابق کیا جاتا ہے، اس کو بنانے میں بیر کی

۱- شیعہ عزا نمبر لکھنؤ ۱۴۰۷ھ ص ۱۰۴

لکڑی کا استعمال ہوتا ہے ۔ اس گاؤں کے وسط میں امام باڑہ بھی ہے اور تعزیہ رکھنے کے لیے چوک بھی موجود ہے۔ محرم کی نویں تاریخ کو تعزیہ کے ساتھ جلوس نکالا جاتا ہے جسے پورے گاؤں کے علاوہ قرب و جوار کی آبادیوں جیسے، بلوسرائے، سندر سرائے اور املی پور میں گشت کرایا جاتا ہے۔ سندر سرائے کی پٹھان بستی اور املی پور کے تعزیوں کے ساتھ اس گاؤں کا تعزیہ بلو سرائے کی سرحد پر جمع ہوتا ہے اور یومِ عاشور ان تینوں تعزیوں کو ایک ساتھ کربلا میں دفن کردیا جاتا ہے۔

عزاداری حسینؑ میں اس بستی کے جو لوگ بہت دلچسپی لیتے ہیں ان کے نام یہ ہیں۔

بدھو چوہان ولد گلچرن، راجیو ولد برج موہن، سیتا ولد سیوک، سہیلی ولد نوبت، دیپ چند، ستیہ دیو، لوٹن بہاری، منی لال، رام لال، مہیندر، راجکمار، راجا رام چوہان نجے، گلاب چوہان، دشرتھ چوہان، بجرنگی وغیرہ۔[1]

اعظم گڑھ میں عزاداری کی روایت کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے کسی گوشہ میں بھی مذہب وفرقہ کی قید نہیں ہے، شیعوں کے دوش بدوش اہلِ سنت بھی عزائے امام حسینؑ میں حصہ لیتے ہیں اور غیر مسلم برادران وطن بھی نہایت خلوص اور جوش وخروش کے ساتھ امام مظلوم کی عزاداری کرتے ہیں، صرف پست اقوام کے ہندو ہی عزا دار نہیں بلکہ اونچی ذات کے ہندو بھی عزا داری کرتے ہیں۔ یہاں شیعہ سنی اور ہندو سبھی لوگ اپنے ذوق کے مطابق مجلسوں میں حصہ لیتے ہیں اور سب مل کر ایام عزا مناتے ہیں۔